مولانا عبدالرشید ارشد

ما پدر گم کردہ ایم

حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق مجھ جیسے جاہل اور بے عمل شخص کا کچھ لکھنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ لیکن روایتی بڑھیا کی طرح کہ جو حضرت یوسف علیہ السلام کے خریداروں میں سوت کی اٹی لے کر شامل ہوگئی تھی۔ کافی دنوں کے غور وخوض کے بعد اس خیال سے کچھ لکھنے کی جسارت کر رہا ہوں کہ ایک عاشق رسول، محدث کبیر اور علم وعمل کے مجسمہ کے متعلق کچھ لکھ کر مضمون نگاروں میں شامل ہونا بہت بڑی سعادت ہے اور گمان یہ ہے کہ دوسرے نیک حضرات کی صف میں کھڑا ہونا خدا کو پسند آئے گا اور قیامت کے دن شفیع المذنبین ﷺ کی شفاعت کبریٰ میں شاید اس گنہگار کی سفارش بھی ہو جائے کہ یہ بھی ہمارے محبّ کے متعلق لکھنے والوں میں شامل ہے۔

حضرت مولانا محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ عہد حاضر کے ان نامور علماء محققین میں سے ہیں، جن پر نہ صرف برصغیر بلکہ پورا عالم اسلام بجا طور پر فخر وناز کر سکتا ہے۔ آپ اس صدی کے سب سے بڑے محدث علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے اخص الخواص شاگردان رشید میں سے تھے، بلکہ بعض معاملات اور خصوصیات کے اعتبار سے اپنے نامور استاد سے خصوصی نسبت رکھتے تھے۔ کئی سال کا عرصہ اپنے مشفق استاد کے ساتھ گذارا اور چھ ماہ کا عرصہ تو ایسا گذرا کہ سوائے دو تین گھنٹہ آرام کے آپ کا ہر لمحہ حضرت استاد کے لئے وقف تھا۔ اور حضرت علامہ کو بھی اپنے اس یوسف سے بے پناہ لگاؤ تھا۔ اس کا اندازہ ایک واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ مولانا مرحوم حضرت استاد کی خدمت، پھر اپنے علمی مشاغل کی وجہ سے رات دیر تک جاگتے۔ لہذا صبح فجر کی نماز کے بعد علامہ کے اشغال واوراد کے وقت سو جاتے۔ حضرت علامہ کو اس بات کا علم ہوا تو انہوں نے مولانا کو ایک دن فرمایا کہ: میں فجر کی نماز کے بعد تمہیں فلاں کتاب پڑھایا کروں گا۔ منشا اس کا یہ تھا کہ مولانا صبح کو سویا نہ

کریں۔ کیونکہ حضور خاتم النبین ﷺ نے صبح کو سونے سے منع فرمایا ہے۔ اس طرح مشفق استاد نے اپنی سنت نبوی کی بے مثال اطاعت کی نظیر پیش کی کہ شاگرد کا خلاف سنت عمل کرنا حکمت عملی اور تدبر سے رفع فرمادیا۔

حضرت علامہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ جب بعض اختلافی امور کی بناء پر دارالعلوم دیوبند سے ڈابھیل ضلع سورت بمبئی چلے گئے۔ تو مولانا بنوری بھی ان کے ساتھ ہی ڈابھیل چلے گئے۔ اس ضمن میں ایک واقعہ کا ذکر مناسب ہوگا کہ علامہ اقبال مرحوم کی یہ خواہش تھی کہ حضرت علامہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ اپنا مستقل مستقر لاہور کو قرار دیں اور ان سے موجودہ دور کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے علمی کام لیا جائے۔ علامہ اقبال کی اس پاکیزہ خواہش کا ذکر مولانا سعید احمد اکبرآبادی صدر شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ وایڈیٹر ماہنامہ ''برہان'' دہلی نے ان الفاظ میں کیا ہے:

''ان کے دل میں (علامہ اقبال کے دل میں) حضرت استاد کی کس درجہ عظمت تھی۔ اس کا اس بات سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ دارالعلوم دیوبند میں اختلاف کے باعث جب حضرت استاذ نے اپنے عہدہ صدر الا ساتذہ سے استعفیٰ دے دیا۔ اور یہ خبر اخبارات میں چھپی تو اس کے چندروز بعد' میں ایک دن ڈاکٹر صاحب کے پاس گیا۔ فرمانے لگے کہ: آپ کا یا دوسرے مسلمانوں کا جو بھی تاثر ہو میں بہرحال شاہ صاحب کے استعفیٰ کی خبر پڑھ کر بہت خوش ہوا ہوں۔ میں نے بڑے تعجب سے عرض کیا کہ ''آپ کو دارالعلوم دیوبند کے نقصان کا کچھ ملال نہیں ہے۔'' فرمایا: کیوں نہیں؟ مگر دارالعلوم کو صدرالمدرسین اور بھی مل جائیں گے اور یہ جگہ خالی نہ رہے گی' لیکن اسلام کے لئے اب جو کام میں شاہ صاحب سے لینا چاہتا ہوں۔ اس کو سوائے شاہ صاحب کے کوئی دوسرا نہیں کرسکتا۔''

اس کے بعد انہوں نے اس اجمال کی تفصیل بیان کی کہ آج اسلام کی سب سے بڑی ضرورت فقہ کی جدید تدوین ہے' جس میں زندگی کے ان سینکڑوں مسائل کا صحیح اسلامی حل پیش کیا گیا ہو' جن کو دنیا کے موجودہ قومی اور بین الاقوامی، سیاسی، معاشی اور سماجی احوال وظروف نے پیدا کردیا ہے۔ مجھ کو پورا یقین ہے کہ اس کام کو میں اور شاہ صاحب دونوں مل کر ہی کرسکتے ہیں۔ ہم دونوں کے علاوہ اور کوئی شخص عالم اسلام میں ایسا نظر نہیں آتا جو اس عظیم الشان ذمہ داری کا حامل ہوسکے۔ پھر فرمایا۔ ''یہ مسائل کیا ہیں اور ان کا سرچشمہ کہاں ہے؟ میں ایک عرصے سے ان کا بڑے غور سے مطالعہ کررہا ہوں۔ یہ سب مسائل میں شاہ صاحب کے سامنے پیش کروں گا اور ان کا صحیح اسلامی حل کیا ہے؟ یہ شاہ صاحب بتائیں گے' اس طرح ہم دونوں کے اشتراک وتعاون سے فقہ جدید کی تدوین عمل میں آجائے گی۔'' چنانچہ باخبر اصحاب کو معلوم ہے کہ اس جذبہ کے تحت ڈاکٹر صاحب مرحوم نے بڑی کوشش کی کہ کسی طرح شاہ صاحب دیوبند کی خدمت سے سبکدوش ہونے کے بعد لاہور تشریف لے آئیں اور

وہیں مقیم ہوجائیں۔ لیکن افسوس! حالات کچھ اس قسم کے تھے کہ ایسا نہ ہوسکا اور حضرت شاہ صاحب لاہور کی بجائے ڈابھیل تشریف لے گئے۔ جس کا ڈاکٹر صاحب کو بڑا ملال اور افسوس رہا۔''

مولانا اکبرآبادی مزید تحریر فرماتے ہیں:

''باخبر حضرات جانتے ہیں کہ پنجاب کے خصوصا اور ہندوستان کے عموماً انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ میں قادیانی فرقہ کی شرانگیزی اور اسلام کشی کا جو احساس پایا جاتا ہے۔ اس میں بڑا دخل ڈاکٹر اقبال مرحوم کے اس لیکچر کا ہے، جو ختم نبوت پر ہے اور ساتھ ہی اس مقالہ کا۔ جو انگریزی میں قادیانی تحریک کے خلاف شائع ہوا تھا' لیکن یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ دونوں تحریروں کا اصل باعث حضرتنا الاستاذ مولانا سید محمد انور شاہ صاحب ہی تھے۔''(۱)

(''بیس بڑے مسلمان'' ص ۳۷۶، ۳۷۷۔ تیسرا ایڈیشن۔ مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ لمیٹڈ۔ شاہ عالم لاہور)

حضرت مولانا بنوری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے استاد کی اس طرح خدمت کی اور اس طرح ان کے علوم کو اپنے اندر جذب کیا کہ جس کی داستانیں اسی حلقے میں پائی جاتی ہیں کہ جس سے مولانا اور حضرت علامہ صاحب وابستہ تھے۔ یا پھر متقدمین کے ہاں ملتی ہیں۔ دوسرے حلقوں میں شاید اس کا عشر عشیر بھی نہ مل سکے اور آج تو ہم اس کا تصور بھی نہیں کرسکتے اور اسی خدمت کی سعادت ہے کہ مولانا کو علمی حلقوں میں علامہ کشمیری کے علوم کا وارث اور جانشین سمجھا جاتا ہے۔

اکابر علمائے دیوبند اپنی للہی خلوص وصفات کی بناء پر پراپیگنڈا اور اس طرح کی دوسری چیزوں کی طرف توجہ نہیں دیتے تھے۔ ان کی نگاہ ہمیشہ اپنے مشن اور کام پر رہی۔ البتہ حجاز میں حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کے قیام حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی، حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری، حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اور شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے برسہا برس درس وتدریس، حضرت مولانا مفتی

(۱) راقم الحروف نے مولانا عبدالحنان ہزاروی سابق ناظم جمعیۃ علماء ہند سے خود سنا۔ وہ فرماتے ہیں کہ جب حضرت شاہ صاحب نے دارالعلوم سے استعفیٰ دیا۔ میں ان دنوں لاہور آسٹریلیا مسجد میں خطیب تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے دیوبند ایک تفصیلی تار دیا جس میں شاہ صاحب سے درخواست کی گئی تھی کہ آپ لاہور تشریف لے آئیں اور یہیں قیام فرمائیں۔ جوابی تار تھا، جس کا کوئی جواب نہ آیا جس پر ڈاکٹر صاحب نے مجھ کو (مولانا ہزاروی کو) دیوبند بھیجا کہ تم جاکر زبانی عرض کرو۔ میں گیا تو معلوم ہوا کہ شاہ صاحب کو وہ تار اس وقت دیا گیا جب ڈابھیل والوں نے اصرار کرکے وہاں تشریف لے جانے پر رضامند کرلیا تھا۔ میں ملا تو فرمایا۔ افسوس کہ آپ کا پیام بعد میں ملا اور میں ڈابھیل والوں سے وعدہ کرچکا۔ اس سلسلہ کی ایک کڑی یہ ہے۔ جو بعض ثقہ حضرات (میاں محمد ممتاز بودلہ مسترشد حضرت مولانا سید محمد بدر عالم مدنی رحمۃ اللہ علیہ) نے بیان کی کہ ڈاکٹر صاحب نے شاہ صاحب کی متوقع آمد کے پیش نظر متمول دوستوں سے پچاس ساٹھ ہزار روپے کے وعدے لئے تھے کہ حضرت علامہ کے لئے شایان شان کوٹھی تعمیر کی جائے جہاں وہ قیام فرماہوں۔ (ارشد)

کفایت اللہ اور حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی کے مؤتمر حجاز میں شاہ ابن سعود کے وقت شرکت کی وجہ سے دار العلوم کی شہرت پہنچ چکی تھی۔ لیکن مصر اور دوسرے ممالک عربیہ میں دار العلوم اور علمائے دیوبند کا تفصیلی تعارف حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ کی وجہ سے ہوا کہ آپ نے وہاں کے رسائل وجرائد میں دار العلوم دیوبند کے دینی وعلمی خدمات کے متعلق مضامین تحریر فرمائے (۱)۔

قیام پاکستان کے وقت آپ ڈابھیل ہی میں تدریس وتعلیم حدیث کی خدمات میں منہمک تھے۔ جب کہ آپ کا وطن مالوف ضلع پشاور پاکستان تھا' لیکن استاد مکرم کی پیروی اور دیگر خادمان علوم دین کی طرح اپنے گھر سے دور خدمت دین سرانجام دے رہے تھے کہ شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے (جو پاکستان تشریف لاکر کراچی میں پرچم پاکستان کی نقاب کشائی کر چکے تھے) حضرت مولانا کو پاکستان بلا بھیجا۔ ان کا خیال تھا کہ پاکستان میں دار العلوم دیوبند کی طرح کا ایک دار العلوم قائم کیا جائے اور اس مین مرکزی شخصیتوں کو یک جا کر دیا جائے کہ عالم اسلام کی اس سب سے بڑی مملکت میں اس وقت کوئی مرکزی دینی ادارہ نہ تھا۔ علامہ عثمانی رحمۃ اللہ علیہ خود تو ہجرت کر کے آئے تھے' لیکن مولانا بنوری کا یہ وطن تھا۔ اس طرح حضرت مولانا سید محمد بدر عالم، حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ' حضرت مولانا محمد رفیق کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کو دعوت دی تا کہ قرآن وحدیث وفقہ کے یہ متبحر عالم ایک ادارہ میں کام کریں۔ اگر شیخ الاسلام کا یہ منصوبہ کامیاب ہو جاتا تو اس میں کوئی شک نہیں کہ جس جامعہ میں ایسے اساتذہ جمع ہو جاتے' وہ اپنی مثال آپ ہوتا۔ علامہ صاحب کی نظر ایسے دار العلوم کے لئے کراچی پر تھی، لیکن حضرت علامہ کا جلد انتقال ہو گیا اور حضرت مولانا محمد یوسف اپنے وطن تشریف لاکر ٹنڈو الہ یار میں تدریس حدیث کے فرائض سرانجام دینے لگے۔ جو حضرت علامہ مرحوم کی ہی سرپرستی میں قائم ہوا تھا۔ لیکن اس جامعہ کے مہتمم صاحب سے اختلاف کی بناء پر حضرت مولانا اس مدرسہ سے جلد ہی علیحدہ ہو گئے اور توکلاً علی اللہ نیوٹاؤن جمشید روڈ پر مدرسہ عربیہ کی بنیاد رکھ دی۔ علامہ شبیر احمد رحمۃ اللہ علیہ کے خواب کی تعبیر حضرت بنوری کے خلوص نے پوری کی کہ آج مدرسہ عربیہ نیوٹاؤن پاکستان میں وہ واحد مدرسہ ہے، جو اپنی منفرد خصوصیات کی بناء پر دار العلوم دیوبند کے بعد پرائیویٹ سیکٹر میں مثالی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی خوبیوں اور صفات کے متعلق میں

---

(۱) اور اس کی ایک وجہ فاضل بریلوی مولانا احمد رضا خاں بھی ہوئے کہ انہوں نے بعض نامعلوم وجوہ کی بنا پر اکابر دیوبند کے متعلق ناگفتی باتیں اپنے الفاظ میں بیان کر کے بلاد عربیہ کے علماء سے فتاویٰ حاصل کئے جو حکومت برطانیہ کے زمانہ میں ان مجاہدین وخادمان دین کے خلاف لاکھوں کی تعداد میں شائع ہو کر تقسیم کئے گئے اور اس پر بلاد عربیہ کے ان علماء نے اکابر دیوبند سے ایک استفسار کے ذریعہ ان عقائد کے بارے میں پوچھا تو علمائے دیوبند نے اس کا جواب دیا جس پر ان تمام علماء نے لکھا کہ آپ کے خیالات توہین اسلامی ہیں۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "المهند على المفند"۔

کچھ عرض نہیں کرنا چاہتا۔ کہ اسی نمبر کے دوسرے صفحات پر سب کچھ رقم ہوگا۔ بس اتنا عرض کروں گا کہ یہ مدرسہ اس دور میں علم وعمل کے تاجدار اور حسن و جمال کے حامل یوسف کی ظاہری و باطنی خوبیوں کا عکس جمیل ہے۔

تحریک تحفظ ختم نبوت اور رد قادیانیت میں یوں تو برصغیر پاک و ہند کی اکثر جماعتوں اور علماء نے حصہ لیا اور بہت کام کیا' لیکن اس کے لئے جتنی دردمندی، دلسوزی اور تڑپ دو بزرگوں میں تھی' وہ شاید سب سے ممتاز ہو۔ اس میں پہلا نام حضرت مولانا مرحوم کے استاذ حضرت علامہ انور شاہ کشمیری کا ہے اور دوسرا نام اردو زبان کے سب سے بڑے خطیب مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ اول الذکر نے اپنے تمام نامور تلامذہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع، حضرت مولانا سید محمد بدر عالم، حضرت مولانا محمد انوری، حضرت مولانا مرتضیٰ حسن چاند پوری، حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی کو اس طرف متوجہ کیا اور ان حضرات نے علمی انداز میں مرزائیت کا تعاقب کیا۔ اور حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور حضرت مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کو بھی اس طرف لگایا' بلکہ بخاری صاحب کو حضرت شاہ صاحب نے امیر شریعت قرار دے کر ہزاروں علماء کی موجودگی میں انجمن خدام الدین لاہور کے جلسہ میں خود بھی بیعت کی اور دوسرے علماء سے بھی کرائی۔ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کے اجداد نے تو سب سے پہلے مرزا غلام احمد قادیانی پر کفر کا فتویٰ لگایا تھا' لیکن حضرت کشمیریؒ کی تڑپ اور حکم نے شاگرد کو اور زیادہ اس پر متوجہ کیا۔ زیادہ تفصیل میں نہیں جانا چاہتا کہ تفصیل نمبر میں مل جائے گی۔ عرض یہ کرنا چاہتا ہوں کہ مرزائیت جب اپنے منطقی انجام کو پہنچی تو اس وقت تحریک کی قیادت حضرت علامہ انور شاہ کشمیری کے جانشین حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ کر رہے تھے۔ اور امیر شریعت مولانا سید عطاء اللہ بخاریؒ، مولانا قاضی احسان احمد شجاع آبادیؒ، حضرت مولانا محمد علی جالندھریؒ کی چلائی ہوئی تحریک تحفظ ختم نبوت کے امیر بھی ان دنوں حضرت مولانا موصوف ہی تھے۔

جن دنوں مرزائیت کے خلاف تحریک عروج پر تھی تو ان دنوں ملک کے تمام بڑے روزناموں میں (نوائے وقت کے علاوہ) حضرت مولانا کے خلاف پہلے صفحہ پر ایک بہت بڑا اشتہار چھپا، جس میں حضرت مولانا پر بہت کچھ طعن کیا گیا تھا۔ اور یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی تھی کہ گویا مولانا حال ہی میں انڈیا سے تخریبی کارروائیوں کے لئے پاکستان آئے ہیں۔ حالانکہ مولانا کا وطن تو پاکستان تھا اور وہ ۱۹۵۱ء میں پرمٹ پر اپنے وطن آئے تھے۔ اور ہمارے سابقہ وزیر اعظم نے بھی اپنے ایک بیان میں ایسا فقرہ کہا، جس میں حضرت مولانا کا نام تو نہیں لیا گیا لیکن اس کا ہدف حضرت مولانا ہی تھے۔ یہ اشتہارات اخبارات کو کہاں سے مہیا ہوئے، کس جگہ بیٹھ کر اشتہار کی عبارت بنائی گئی اور کون پردہ نشین اس میں شریک تھے، ہمیں اس سارے ڈرامے کی تفصیل معلوم ہے' لیکن یہاں ذکر اس لئے نہیں کرتے کہ آج کل وہ سبھی معتوب ہیں اور ہمیں خدشہ ہے کہ جان بوجھ کر ایک

پاکباز محدث پر انہوں نے جس طرح حکومت کے اشارہ پر الزامات لگائے اور در پردہ مرزائیت کی حمایت کی، کہیں یہ فعل ان کے سوءِ خاتمہ کا باعث نہ ہو...... مرزائیت کے خلاف اس تحریک کی مجلس عمل کے کنوینر یا امیر کے لئے حضرت مولانا سے بہتر شخصیت کوئی اور نہ تھی۔ بلکہ یوں کہنا صحیح ہوگا کہ اگر مولانا کو نظر انداز کر کے کسی اور کو امیر بنایا جاتا تو مجلس کی نمائندگی میں بہت بڑا خلا ہوتا۔ حضرت مولانا کے لئے یہ بات بایں طور تو اعزاز تھی کہ آپ اس مجلس کے امیر بنائے گئے جو تحفظ ناموس ختم نبوت کے لئے بنائی گئی تھی، ورنہ حضرت مولانا اس قسم کے عہدوں اور مناصب سے بلند تھے۔ آپ اپنے علم و عمل اور تقویٰ و طہارت کے لحاظ سے صحیح معنوں میں سلف صالحین کی جیتی جاگتی تصویر تھے اور ان کے چہرہ سے مردِ مومن کی تمام علامات و صفات ٹپکتی تھیں۔ حد درجہ حساس تھے اور پاکستان و عالمِ اسلام کے حالات کو دیکھ کر ماہی بے آب کی طرح تڑپتے تھے۔ ماہنامہ ''بینات'' کے شذرات بصائر و عبر کے نام سے آپ تحریر فرماتے تھے۔ جن لوگوں نے ان شذرات کا مطالعہ کیا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ آپ کس درد اور فکر کے مالک تھے۔ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے میرِ کارواں کے لئے جس نگہ بلند، سخن دلنواز اور جان پرسوز کا ذکر کیا ہے، مولانا کی ذات میں وہ بدرجہ اتم پائی جاتی تھیں۔ بایں ہمہ مولانا نے اپنے آپ کو دینی خدمات کے لئے وقف کئے رکھا اور کبھی بر سرِ عام منظر آرائی نہیں کی، یہی وجہ ہے کہ تحریک ختم نبوت سے پہلے ممالک اسلامیہ کے تمام جید علماء تو آپ کی عربی تصانیف کی وجہ سے آپ کے نہ صرف واقف و متعارف، بلکہ علم و فضل کے معترف تھے، لیکن اندرون ملک عام لوگ مولانا سے متعارف نہ تھے۔ تفصیلی تعارف مجلس عمل کے امیر بننے اور حکومت کے جہازی اشتہاروں سے ہوا اور یا پھر اب عبوری حکومت نے جو نظریاتی کونسل قائم کی تھی، اس کے سب سے وقیع ممبر ہونے کی وجہ سے تمام ملک نے جانا، لیکن اگر یہ سب کچھ نہ بھی ہوتا تو بھی حضرت مولانا نے علمی دنیا میں اپنی تصانیف اور شروح کے ذریعہ جو عربی میں کام کیا ہے، اس کی وجہ سے تمام ممالک اسلامیہ میں آپ کو بقائے دوام اور حیاتِ جاوداں حاصل تھی۔

مولانا موصوف اپنے افکار میں شدت اور دین کو بطور دین ہی اختیار کرنے کے اس شدت سے قائل تھے کہ وہ طلبائے دین کا دینی علوم کو ملازمت یا ذریعہ معاش کے حصول کے لئے پڑھنے کو ضیاعِ وقت اور گناہ سمجھتے تھے او یہ بات کسی دلیل کی محتاج نہیں کہ دین کی اشاعت و خدمت وہی لوگ کر سکتے ہیں، جو دین کو رضائے الٰہی اور اشاعت دین کے لئے پڑھیں اور پھر دین ہی کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیں، دنیا کمانے کے دھندے میں نہ پڑیں۔ اس ضمن میں ایک واقعہ کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ڈھاکہ میں ملک کے نامور علماء کا ایک اجتماع ہوا، جس میں اس بارے میں غور و فکر کرنا مطلوب تھا کہ دینی مدارس میں دینیات کے علاوہ کچھ شعبے ایسے بھی ہونا چاہئیں کہ طلباء جو فارغ التحصیل ہو کر نکلیں تو وہ معاش میں کسی کے محتاج نہ ہوں۔ اور وہ اپنی فنی تعلیم کو بروئے کار لا

کراپنے معاش سے مطمئن ہوسکیں۔حضرت مولانا بھی ڈھا کہ گئے۔وہاں رات کوانہوں نے خواب میں دیکھا کہ مسجد کے فرش پر بہت جلی حروف میں...... **النجاة فی علوم المصطفی**......لکھا ہوا ہے۔مولانا اس کو پڑھتے ہیں اور ساتھ خواب ہی میں بلند آواز سے اس جملہ کے ساتھ ''**سید السادات**'' کا اضافہ کرتے ہیں۔ صبح کو مولانا نے اجلاس میں شرکت نہ فرمائی اور کراچی واپس تشریف لے آئے اور اپنے مدرسہ کی سند میں ان الفاظ کا اضافہ کردیا۔

ان کے تجر علمی اور سرچشمہ ہدایت قرآن مجید سے ان کی گہری وابستگی اور اس کے علوم ومعارف کو صحیح طریق سے اشاعت کرنے کی لگن کے سلسلہ میں ایک واقعہ بطور مثال پیش کیا جاتا ہے......اور وہ یہ کہ مصر کے ایک بہت بڑے عالم علامہ طنطاوی مرحوم نے پندرہ سولہ جلدوں میں قرآن پاک کی ایک تفسیر بنام''جواہر القرآن'' لکھی ہے، جسے اس دور کی تفسیر کبیر کہا جاتا ہے۔اس تفسیر میں انہوں نے عام متنورین کی طرح اس بات پر بہت بحث کی کہ قرآن تمام علوم جدیدہ کا ماخذ اور سرچشمہ ہے۔سائنس، فلسفہ جدیدہ اور فلکیات وغیرہ کے علوم کو قرآن پاک سے ظاہر کرنے یا نکالنے کی کوشش کی ہے۔حضرت مولانا نے جب یہ تفسیر پڑھی تو ان کو بہت دکھ ہوا کہ قرآن پاک کو ان علوم کا رہنما ومبلغ ثابت کرنے کی کوشش کرنا بہر حال قرآن پاک کے مقاصد کے خلاف ہے۔ قرآن مجید کا مرکزی نقطہ انسانی ہدایت ہے کہ انسان اپنے خالق و مالک کو پہچان کر عبودیت وعبدیت کی راہ اختیار کر کے عبادت کا حق ادا کرے اور یہ دنیا کہ جسے حدیث میں آخرت کی کھیتی کہا گیا ہے۔اس پر رہ کر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کر کے ذخیرہ آخرت جمع کیا جائے۔اور اگر انہی امور کی طرف توجہ دلانے کے لئے قرآن مجید میں بحر و بر، شمس وقمر کو یا کواکب وجبال اور اشجار واحجار اور دوسری معدنیات وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے تو ان اشیاء کی تخلیق اور حرکات وسکنات اور گردش یا تسخیر شمس وقمر کو وجود باری تعالیٰ کے اثبات اور عقیدہ توحید کے دلائل کے طور پر پیش کیا گیا ہے، نہ کہ سائنسی علوم وفلسفہ وغیرہ میں رہنمائی کے لئے۔اس تفسیر کا بلاد اسلامیہ میں بہت شہرہ ہوا۔حضرت مولانا بنوری رحمۃ اللہ علیہ نے عزم فرمایا کہ علامہ طنطاوی کو ان کے اس فکر ونظر کی غلطی اور اس کے عواقب ونتائج سے آگاہ کیا جائے۔لیکن علامہ طنطاوی اہل زبان اور مصر کے مایہ ناز عالم تھے اور حضرت مولانا عجمی اور پھر ان دنوں ابھی جوان تھے۔چنانچہ ان دنوں تائید ایزدی کے حصول کے لئے پہلے مہبط وحی ام القری یعنی مکہ معظّمہ میں حاضری دی اور خانہ کعبہ کا غلاف پکڑ کر ملتزم سے لپٹ کر رو رو کر (کہ اجابت دعا کا مقام ہے) دعا کی کہ یا اللہ! تیرے قرآن کی خاطر علامہ طنطاوی سے گفتگو کرنے جا رہا ہوں۔شرح صدر عطا فرما۔اور اس کے بعد قاہرہ جا کر علامہ طنطاوی سے مفصل گفتگو کی۔علامہ طنطاوی باوجود علامہ فہامہ ہونے کے سلیم الطبع تھے اور اپنی غلطی کے اعتراف واقرار سے انہیں اپنا وقار یا علم مجروح ہوتا نظر نہیں آتا تھا، جیسا کہ آج کل کے متجددین

کا وطیرہ ہے۔ انہوں نے قصورِ فہم کا اعتراف کیا اور وہ بار بار اپنے ہاتھوں کو کانوں تک لے جاتے تھے اور تحیر انگیز لہجے میں بار بار فرماتے تھے۔ اب آپ سے اس حدیث کا مطلب سمجھا ہوں۔ اور یہ بھی فرمایا کہ: لست بعالم هندی بل انت ملک نزل من السماء لا صلاحی۔ آپ ہندی عالم نہیں ہیں' بلکہ آپ تو فرشتہ ہیں، جو میری اصلاح کے لئے آسمان سے اترے ہیں۔''

اور وہ خیال فرمارہے تھے کہ ہندوستان کے سب سے بڑے عالم سے محوِ گفتگو ہیں۔ حالانکہ امر واقعہ یہ تھا کہ ان دنوں حضرت بنوری کے کئی اساتذہ بقیدِ حیات تھے کہ حضرت مولانا کے مقابلے میں اپنے آپ کو شاید ان کی جوتوں کی خاک کے برابر بھی درجہ نہ دیتے ہوں۔

حضرت مولانا جس قبیلہ عشاق سے تعلق رکھتے تھے وہ اپنے اساتذہ اور شیوخ کا ایسے ہی انداز میں احترام کرتے تھے اور ایسا کرنے میں شاید مبالغہ بھی نہ ہو کہ ان حضرات کے اساتذہ علامہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ اور علامہ عثمانی رحمۃ اللہ علیہ ایسے ہی لوگ تھے۔ میں نے اپنے کانوں سے حضرت مولانا احمد علی لاہوری رحمۃ اللہ علیہ سے ایک خطبہ جمعہ میں سنا کہ آپ بادیدۂ تر فرمارہے تھے کہ میں جب اپنی داڑھی میں کنگھی کیا کرتا تھا تو جو بال اکھڑتے تھے، ان کو جمع کرتا جاتا تھا اور خیال یہ تھا کہ جب کافی ہو جائیں گے تو پھر اس طرح کا ایک جوتا بنواؤں گا کہ جیسا حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ پہنتے تھے اور اس جوتے میں یہ بال سلواؤں گا۔ اور احمد علی یہ خیال کرتا ہے کہ اگر حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ یہ جوتا پہن لیتے تو احمد علی کی نجات کے لئے کافی ہوتا..... یاد رہے کہ حضرت لاہوری نہ تو حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے نہ مرید، اور نہ ہی حضرت مدنی کے سلسلہ کے شیوخ کے مرید، بلکہ آپ سلسلہ قادریہ میں حضرت دین پوری اور حضرت امروٹی سے تعلق رکھتے تھے۔ اہل عقل کے لئے یہ باتیں دیوانگی کی باتیں ہوں گی۔ لیکن اہل نظر جانتے ہیں کہ یہ وہ لوگ ہیں، جو بقول اقبال:

ید بیضا لئے پھرتے ہیں اپنی آستینوں میں

حاصل کلام یہ کہ حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ اس دور میں علم وعمل کا ایک ایسا مرقع، تقویٰ وطہارت کا ایسا مجسمہ، زہد وقناعت اور توکل علی اللہ کا ایک ایسا پیکر اور اطاعت خدا اور سنت رسول کا ایسا وجود تھے کہ ان کی مثال اب ڈھونڈے سے نہیں ملے گی اور کم از کم ہم اپنی آنکھوں سے ایسا شخص دوبارہ نہیں دیکھ پائیں گے۔

زمین کھا گئی آسماں کیسے کیسے